حاصلِ مطالعہ

علامہ اقبال

سیرت اکیڈمی میں کی گئی

تقریر 23 جنوری 2012 ء

محمد بشیر ہرل

محمد بشیر ہرل

یہ مضمون اولاً نوجوانوں کی ایک مجلس میں ۲۷ نومبر ۱۹۸۸ء کو پڑھا گیا تھا۔ چند اضافی نکات واشعار شامل کرکے ۲۲ جنوری ۲۰۱۲ء کو سیرۃ اکیڈمی فیصل آباد میں پڑھا گیا۔

بہ سلسلہ "حاصلِ مطالعہ"

علامہ سر محمد اقبال

حضراتِ محترم، السلام علیکم۔

اس معتبر مجلس میں مجھ جیسے ہیچ مدان کو اظہارِ خیال کا موقع دے کر میری عزت افزائی کی گئی ہے، جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ گھرانا دیندار تھا، آپ کے والد شیخ نور محمد متقی انسان تھے، انھوں نے علامہ کو بچپن ہی سے دین کی طرف رغبت دلائی۔ تلاوت، نماز، حسنِ اخلاق، بڑے چھوٹے کے آداب سکھائے۔ قرآن پاک خوب محنت سے پڑھایا۔ صبح کی تلاوت کی پابندی کی عادت ڈالی۔ ان کی ہدایت تھی کہ قرآن ایسے پڑھا کرو جیسے یہ تم پر ہی نازل ہوا ہے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا۔ اس سے علامہ کو قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے اور قرآن حکیم کو دل کی دنیا میں اتارنے کی صلاحیت ملی۔ آپکی سیرت کی تعمیر میں قرآن پاک بنیادی محرک تھا۔ اسی نے انکی سوچ کو عام شعروں کی سطح سے بلند کیا۔ ۱۸۹۸ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کی، اور ۱۸۹۹ء میں ۲۲ سال کی عمر میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۰۰ء میں اورینٹل کالج میں بطور لیکچرر پڑھانا شروع کیا اور بعد میں ۱۹۰۵ء تک گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے رہے۔ اسی دوران اردو شاعری میں بتدریج نام پیدا کیا۔ آپکی اس دور کی شاعری میں ہندی قومیت کا جذبہ نمایاں تھا۔ لیکن علامہ کی وجہِ شہرت ان کی وہ عالمگیر شاعری ہے جس کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان صدیوں تک دلوں کو گرماتا رہے گا۔

۱۹۰۵ء میں ۲۸ برس کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے، وہاں ۱۹۰۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ڈگری لی، اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے "فلسفۂ ایران" پر تحقیق پر PhD کی ڈگری حاصل کی۔ جرمنی سے لندن واپسی پر بار ایٹ لاء کیا۔ قیامِ لندن کے دوران اسلام پر چھ مشہور پبلک لیکچرز دیئے۔ لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے چھ مہینے تک عربی زبان کے پروفیسر بھی رہے۔ یورپ کے قیام کے دوران بھی سحر خیزی، نماز اور تلاوت ان کا معمول رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اساتذہ نے ان کے ساتھ بہت سنجیدہ تعلق رکھا اور علوم کو ان کے سینے میں اتار دیا۔ یہاں علامہ کو تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ اور بالخصوص گوئٹے کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے ان کے خیالات میں بہت واضح تبدیلی آئی۔ وطن واپسی تک آپ کی عمر 31 برس ہو چکی تھی۔ آپ کو سنسکرت، اردو، فارسی، عربی ادب، انگریزی ادب اور یورپ کی کئی زبانوں میں مہارت حاصل ہو چکی تھی اور علوم القرآن، تاریخ، جغرافیہ، مختلف تہذیبوں اور قانون جیسے موضوعات پر مسلم، یورپی، عیسائی اور یہودی علماء کا عمیق مطالعہ کر چکے تھے۔ وہیں قیام کے دوران آپ کو مغربی تہذیب کے زوال کا ادراک ہوا۔ جب انہوں نے قریب سے دیکھا تو اس کی ساری خرابیاں ان پر عیاں ہو گئیں۔ برگساں کے فلسفہ نے ان کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا اور انھوں نے مغربی تہذیب کو کڑی تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا، جیسے: تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔

اپنے اس وسیع علمی پس منظر کے ساتھ جب آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کے حالات پر غور شروع کیا تو اُس بے علم اور بے عمل خانقاہی مسلمانی سے سخت بیزار ہو گئے جسے عرفِ عام میں غلط طور پر تصوف کا نام دے دیا گیا تھا۔ اسی نے مسلمان قوم کو کمزور کیا تھا۔ اور ہندوستان میں ان کے سیاسی زوال کا باعث بنا تھا۔ مثنوی اسرارِ خودی میں آپ نے اس بے عملی کے خلاف تڑپ کر آواز اٹھائی۔ انہیں ملت کی زبوں حالی اور قرآن سے مسلمانوں کی دوری کا ادراک اور بہت قلق تھا۔ آپ نے ہندوستانی قومیت پرستی ترک کر کے اسلامی قومیت کے تصور کو اپنایا۔ تحریکِ ترکِ موالات کے دوران "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کہنے والا پکار اٹھا "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسلامی امت کے طور پر جدوجہد کرنی چاہئے۔ وہ فلسفی بار ایٹ لاء، مغربی فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے شناور ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخِ ہند، تاریخِ اسلام، اور ملتِ اسلامیہ کے عروج و زوال سے پوری طرح آگاہ تھے اور اس کے ذہنی و عملی انحطاط کو دور کرنے کے لئے آتش بے قرار تھے۔ مسلم تہذیب کے زوال کی وجوہات کا تجزیہ ان کا محور تھا۔ قوم کی بے مائیگی، بے بسی، اپنے وجود سے بے خبری اور اپنے تہذیبی اور اخلاقی سرمائے کی بے قدری اپنے کلام میں بڑے دردمندانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ۱۹۲۱ یا ۱۹۲۲ء میں نظم خضرِ راہ سامنے آئی جو پہلی جنگِ عظیم میں اسلامی خلافت و عظمت کے زوال کا نوحہ تھی، اور جس کو انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھتے ہوئے ۲۵ ہزار سامعین کے ساتھ ساتھ خود علامہ کی بھی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

علامہ کو اپنے کلام کے ردِعمل میں سنگ پاشی کا بھی سامنا رہا۔ شکوہ جیسی عدیم النظیر نظم پر وہ شور اٹھا کہ آپ کو جواب شکوہ لکھنا پڑا۔ اسی طرح مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد افلاطون اور حافظ شیرازی کے کچھ "پرستاروں" نے ایسا غل مچایا کہ علامہ کو شعبدہ باز، خر، دشمنِ اسلام، رہزنِ اسلام، بندۂ دنیا، دین فروش، ملت فروش اور آئین فروش تک قرار دے دیا۔ ایک صاحب "خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد فضلی" نے تو ایک جوابی مثنوی بھی شائع کرا ری جس میں علامہ کو ان الفاظ سے یاد فرمایا گیا تھا: بندۂ دنیا، بہ دنیا دین فروش۔۔۔ بر سرِ ملت فروش، آئین فروش۔" لیکن اس عظیم انسان اور علم کے بحرِ ذخار نے انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے اس مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں خواجہ حافظ کے متعلق وہ اشعار حذف کر دیئے اور ان کی بجائے نئے، قابلِ قبول اشعار لکھ دیئے۔ حتیٰ کہ دفعِ شر کی خاطر اس کا مفید اور دلچسپ دیباچہ بھی نکال دیا۔ آپ نے یہ مشکل لیکن دانشمندانہ فیصلہ بالکل درست کیا۔ مباحث میں پڑنے کی بجائے اپنے پیغام پر توجہ مرکوز رکھی۔ آپ مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء تا ۱۹۷۹ء) کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے جو علامہ کی وفات کے بعد انہوں نے ۱۹۳۸ء میں لکھے گئے اپنے ایک مضمون بہ عنوان "حیاتِ اقبال کا سبق" میں استعمال کیے ہیں: ۔۔۔"اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شئے واحد تھے، اور اس شئے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لاء سے لگا کھاتا ہو۔"

ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اگرچہ میری اور آپکی طرح گوشت پوست کے انسان تھے، پھر اُنکی اس شہرت کی وجہ کیا تھی۔ علامہ درجہ بدرجہ ان بلندیوں پر کیسے پہنچ گئے کہ دنیا انہیں ایک عظیم مفکر کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے، انہوں نے گوئٹے کے نظریئے کے مقابل فلسفۂ مشرق پیش کیا، ہٹلر اور مسولینی کے نظریات و اعمال پر رائے دی، اقتصادیات پر لاثانی مقالے تحریر کئے، غلامی کی تمام قباحتوں کو ابھار کر پیش کیا، اور، اپنی قوم کے اندر جذبۂ خود اعتمادی اور آزادی کی لگن پیدا کر دی، حتیٰ کہ ان کے پیش کردہ تصور نے تاریخِ عالم کی ایک منفرد حقیقت یعنی پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔ علامہ کی طبیعت میں بچپن کی تعلیم و تربیت نے علم و ادب سے قدرتی مناسبت پیدا کر دی تھی، پھر مولوی میر حسن جیسے بحرالعلوم سے فارسی اور عربی زبانوں پر عبور کے حصول کے دوران تاریخ و اخلاقیات سے شناسائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، چنانچہ سکول کے زمانہ میں ہی کلام موزوں ہونے لگا۔ اور کبھی کبھی سیالکوٹ کے مقامی مشاعروں میں اپنا کلام سنانے لگے۔ بعد میں ایک مختصر عرصے تک آپ اپنے کلام کی اصلاح بذریعہ ڈاک اُس وقت کے مشہور و معروف شاعر، اور نظامِ دکن کے استاد، نواب میرزا خان داغ دہلوی سے بھی لیتے رہے۔ داغ دہلوی کا مزاج دوسرا تھا۔ تبرک کے طور پر داغ کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:

سرِ محفل، مجھی سے، تجھ کو ظالم، پردہ کرنا تھا ۔۔۔ پھر اس پر یہ قیامت، غیر کے دامن سے منہ ڈھانپا۔ (علامہ کے کلام میں یہ ذوق مفقود ہے)

چنانچہ انہوں نے جلد ہی سمجھ لیا اور علامہ کو بتا دیا کہ اُن کے کلام میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ علامہ کو غالب کے شاگرد مولانا حالی، اور مولانا شبلی کے علاوہ، مولانا اکبرالہ آبادی جیسے بلند پایہ علماء کی رہنمائی بھی میسر رہی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کے دوران آپ نے لاہور کے محدود مشاعروں میں اِکا دُکا نظم یا غزل کہنا شروع کر دی تھی، لیکن آپ کی پہلی نظم جو شائع ہوئی وہ "ہمالہ" تھی، جو ۱۹۰۱ میں رسالہ مخزن میں شائع ہوئی۔ اس نظم کی اشاعت پر خود علامہ اس بنا پر تیار نہ تھے کہ وہ سمجھتے تھے ابھی اس میں بہت اصلاح کی گنجائش تھی۔ اِس کے باوجود اُس ابتدائی (یا اولین مطبوعہ) نظم کی ندرتِ خیال ملاحظہ ہو:

ـــ

ابر کے ہاتھوں میں، رہوارِ ہوا کے واسطے ۔۔۔ تازیانہ دے دیا، برقِ سرِ کہسار نے۔

اے ہمالہ، کوئی بازی گاہ ہے تُو بھی، جسے ۔۔۔ دستِ قدرت نے بنایا ہے، عناصر کے لیئے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر ۔۔۔ فیلِ بے زنجیر کی صورت، اُڑا جاتا ہے ابر۔

(افسوس آج کالج کے اکثر طلباء شائد اسے صحیح تلفظ سے پڑھ بھی نہ سکیں گے)

یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کی شہرت شروع ہوئی، اور مختلف رسالے، اخبار، انجمنیں اور مجالس درخواستیں کرنے لگے کہ ان کے سالانہ جلسوں میں وہ لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ کریں۔ اسی دوران وہ فارغ التحصیل ہو کر، گورنمنٹ کالج میں لیکچرر ہو چکے تھے۔ چنانچہ اپنے دن رات علمی صحبتوں میں بسر کرنے لگے۔ طبیعت زوروں پر تھی، ایک ایک نشست میں بے شمار شعر کہہ دیتے، اور غضب کے شعر کہنے لگے۔ علامہ اپنی دُھن میں کہتے چلے جاتے اور جو دوست پاس بیٹھے ہوتے، پنسلیں لے کر لکھتے جاتے۔ (ذرا اُس دور کے علم پسند ماحول کا اندازہ لگایئے)۔ جب کلام موزوں ہونے لگتا تو رقت اور وجد کی ایک خاص کیفیت اُن پر طاری ہو جاتی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود جھومتے

تھے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے، لیکن ساری زندگی اُن کی یہ خصوصیت رہی کہ اِس قدر قادرالکلام ہونے کے باوجود فرمائش پر کبھی کچھ نہ لکھ سکے۔ صرف اپنے اندر تخیلات اور فلسفہ کے ابلتے ہوئے لاوے کو سپردِ قلم کرتے رہے۔ علامہ سے پہلے مشاعروں میں لوگ تحت اللفظ پڑھتے تھے لیکن علامہ کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند تھی۔ طرزِ ترنم خوب تھا۔ آپ نظم ترنم سے پڑھتے تو ایسا سماں بندھتا کہ سکوت کا عالم طاری ہو جاتا۔ اسی ترنم کی وجہ سے عام لوگ بھی آپ کا کلام سننے اور سمجھنے لگے۔ لاہور میں انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں علامہ نظم پڑھتے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہو جاتے اور جب تک علامہ نظم پڑھتے رہتے، عوام محو رہتے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو قدرتی طور پر علمِ فلسفہ کی تحصیل کا شوق تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے انہیں کالج میں غیر معمولی قابلیت کے حامل استاد، سر تھامس آرنلڈ کی خصوصی توجہ میسر آ گئی جن کی اپنی قوتِ تحریر بہت اعلیٰ تھی۔ انہوں نے اپنے شاگردِ خاص کو علمی جستجو اور تلاش کے طریقِ جدید سے آشنا کیا۔ اِسی استاد کی محبت اور علم کی لگن آپ کو اُس کے پیچھے پیچھے انگلستان بھی لے گئی۔ (بعد میں وہاں کے پروفیسر نکلسن نے آپ کی مشہور فارسی نظم "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کر کے اور اس پر حواشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو اقبال سے رُوشناس کرایا)۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا عرصہ آپ نے یورپ میں گزارا۔ اِس دوران آپ نے بہت کم نظمیں لکھیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ شاعری بالکل ترک کر دیں گے، اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اس کو کسی مفید کام میں صرف کریں گے۔ اُن کے دوست شیخ عبدالقادر بار ایٹ لاء، اور آپ کے محبوب استاد سر آرنلڈ نے اصرار کیا کہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ہندوستان کی درماندہ مسلم قوم کے امراض کا علاج ممکن ہے۔ چنانچہ یہ جو تغیر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں آیا تھا، اُس کا خاتمہ ہوا، لیکن اِس دوران ایک دوسرا تغیر پیدا ہو گیا اور آپ نے اپنے کلام کے لئے اردو کی بجائے فارسی زبان کو ذریعہ اظہار بنا لیا۔ یورپ میں قیام کے دوران آپ نے فارسی علوم و ادب کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ یورپ سے واپسی پر اگرچہ کبھی کبھی اردو کی بہت معرکے کی نظمیں بھی کہیں مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا جس میں اُن دقیق خیالات کا اظہار ممکن ہوا جو روز افزوں تحقیقی مطالعہ کے نتیجہ میں آپ کے قلب و ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں اپنی انگریزی ڈائری میں آپ نے نوٹ لکھا" قومیں شاعروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اور سیاستدانوں کے ہاتھوں ترقی کرتی یا مرجاتی ہیں"۔ اسی دور میں مثنوی اسرارِ خودی فارسی میں تخلیق کی جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور جس نے آپ کی شہرت ہندوستان سے باہر بھی پورے عالمِ اسلام میں پہنچا دی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا اولین بھرپور اظہار ان کی طویل نظموں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی (مطبوعہ ۱۹۱۸ء) میں پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں طویل نظمیں فارسی میں لکھی گئی ہیں کیونکہ وہ اپنا پیغام ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقات کے علاوہ بیرونِ ہند ملتِ اسلامیہ کو بھی پہنچانا چاہتے تھے، بالخصوص افغانستان اور ایران میں۔ علامہ اقبال کا فارسی کلام ایک بحرِ بیکراں ہے۔ ان کے دل میں اسلام اور ملت کے لئے جو درد، اضطراب اور بے چینی تھی اس کی صحیح عکاسی ان کے فارسی کلام ہی میں ہے۔ رموزِ بے خودی پہلی جنگِ عظیم کے دوران تصنیف ہوئی تھی۔

۲۸ جون ۱۹۱۴ کو سربوں نے ہمسایہ ریاست ہیپس برگ پر قبضہ کر لیا تو اس کے پانچ ہفتہ بعد چار سالہ جنگِ عظیم اول شروع ہو گئی۔ جس میں سربوں کا جانی نقصان کسی بھی دوسری قوم سے زیادہ ہوا، لیکن اسکے نتیجہ میں ایک اسلامی مملکت کی بنیاد پڑ گئی جس میں مونٹی نیگرو، بوسنیا، کروشیا، البانیہ، مقدونیہ اور ہنگری کے سارے علاقے شامل تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) نے جرمنی کا ساتھ دیا اور ۱۹۱۵ میں گیلی پولی کی جنگ میں اتحادی فوج کو شکست دے دی۔ جس کے بعد اتحادی عیسائیوں نے لارنس آف عریبیا کی سازشوں کے ذریعہ عرب علاقوں میں خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کھڑی کروا دی اور پھر دو سال بعد ہی ۱۹۱۷ء میں یروشلم میں عیسائی فوجیں داخل کر دیں۔ اس طرح آٹھ سو سال بعد بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۹۱۹ء میں پیرس امن کانفرنس میں خلافت کا خاتمہ کر کے اسلامی وحدت کا خاتمہ کر دیا گیا، جس پر ہندوستان میں تحریکِ خلافت شروع ہو گئی۔ علامہ اقبال کی توجہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز ہو گئی اور ان کے لئے کچھ کرنے کے لئے بیتاب رہنے لگے۔ ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے علامہ اقبال کو ان کی علمی شناخت پر سَر کا خطاب پیش کیا جس سے ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا اور آپ ڈاکٹر سَر محمد اقبال کے طور پر معروف ہوئے۔ *(ڈاکٹر صاحب کو سَر کے خطاب کی پیشکش ہوئی تو آپ ہی کے اصرار پر آپ کے استادِ گرامی مولوی میر حسن صاحب کو بھی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا)*۔ آپ کا نام لاہور ہائیکورٹ کے جج کے طور پر بھی تجویز ہوا لیکن اس وقت کے ہندو چیف جسٹس نے اتفاق نہ کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اتاترک نے آئینی طور پر خلافت کی حیثیت ختم کر دی۔ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد الجزائر اور تیونس کو فرانس نے قبضہ میں لے لیا۔ لیبیا اٹلی کے ہاتھ آیا، اور سوڈان، فلسطین، اردن، کویت اور عراق برطانیہ کے حوالے کر دیئے گئے۔ اس طرح برطانیہ اور فرانس نے شام۔ لبنان۔ فلسطین اور عراق کو آپس میں تقسیم کر لیا اور ایک لیگ آف نیشنز بنا کر وہاں سے اپنے اقدام کی سندِ جواز حاصل کر لی۔ اسی لیگ آف نیشنز کے قیام پر علامہ اقبال نے کہا تھا: بہرِ تقسیمِ قبور، انجمنے ساختہ اند۔ آپ ۱۹۲۶ء میں ۴۹ سال کی عمر میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں افغانستان میں بچہ سقہ کی بغاوت کے خلاف آپ نے لاہور میں ایک

مظاہرہ کروایا۔ظاہر شاہ کا والد نادرشاہ جو بغاوت کے وقت فرانس میں تھا، بچہ سقہ کے خلاف مزاحمت منظم کرنے کیلیے لاہور آیا تو اس نے علامہ اقبال سے ملاقات کی۔اس ملاقات میں نادرشاہ کے بھائی شاہ ولی خان بھی موجود تھے۔شاہ ولی خان نے وزیرستان میں لشکر منظم کیا اور بغاوت کے ۹ ماہ بعد ہی بچہ سقہ کو شکست دے کر قتل، اور کابل پر قبضہ کر لیا۔ علامہ نے ۱۹۲۹ یا ۱۹۳۰ء میں اپنے ایک جرمن جغرافیہ دان دوست سے شمال مغربی ہندوستان کے نقشے بھی بنوائے جن میں سبز اور کیسری رنگ کے نقطوں سے مسلم اور ہندو آبادی کے تناسب کو ظاہر کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے مسلم قوم کے مطالبات پر مبنی قائدِ اعظم کے چودہ نکات رد کر دیے۔آپ ۱۹۳۰ء میں ۵۲ سال کی عمر میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوگئے اور ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے صدارتی خطبہ ** میں، کم از کم شمال مغربی سرحدی صوبے، پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل خودمختار اسلامی ریاست کا معرکۃ الآرا تصور پیش کیا جو تحریکِ پاکستان کی خشتِ اول ثابت ہوا۔وہ اپنے مشاہدات اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ ہندوستانی مسلمان ہندو اکثریت کے سامنے بے بس تھے اور ان کی تہذیب، تعلیم اور ثقافت کی شناخت خودمختار ریاست کے بغیر ناممکن تھی۔چنانچہ انھوں نے اپنی پوری قوت سے قائدِ اعظم کی حمایت کی۔ان کا کہنا تھا کہ جس قوم کے پاس اپنا ملک نہ ہو وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔دین اور کلچر حکومت و شوکت سے ہی زندہ رہتے ہیں اس لئے مسلمانوں کا الگ ملک ہی مسلم تہذیبی و اقتصادی مشکلات کا حل ہے۔ The Reconstruction of Religous Thought in Islam کے عنوان سے دیے گئے لیکچرز میں ان کے مذہبی اور سیاسی نظریات واضح شکل میں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں برطانوی حکومت کی دعوت پر گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کی۔واپسی پر سپین، اٹلی، فرانس اور فلسطین کی سیر کرتے ہوئے آئے۔ بالِ جبریل کی اکثر نظمیں اسی سفر میں لکھی گئیں۔سسلی اور قرطبہ کے نوحے اسی سفر کا تحفہ ہیں: ؎ رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار -- وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار۔

۱۹۳۳ء میں نادرشاہ نے کابل میں ایک یونیورسٹی کے قیام، نصاب کی تشکیل اور اساتذہ کے انتخاب کیلیے علامہ اقبال کو افغانستان آنے کی دعوت دی، جس پر علامہ اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان تشریف لے گئے اور یونیورسٹی کے قیام کا تحریری منصوبہ نادرشاہ کو پیش کر دیا۔اس دوران آپ نے سارے افغانستان کی سیر کی اور "مسافر" کے نام سے فارسی میں سفرنامہ منظوم کیا۔جس میں نظامِ خلافت کے قیام کی خواہش غالب نظر آتی ہے اور شاہِ افغانستان کو فریاد کرتے ہیں کہ تمھارا سینہ دین کے غم سے صد چاک ہے۔اپنی حکومت اور اپنے زیرِ نگیں ملک میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق کے نظامِ حکومت کو دوبارہ زندہ کرے۔ زندگی کے آخری دور میں ان کی توجہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز ہو چکی تھی اور علامہ نے دوبارہ اردو میں لکھنا شروع کر دیا۔۱۹۳۵ء میں بالِ جبریل اور ۱۹۳۶ء میں ضربِ کلیم منصۂ شہود پر آئیں۔

دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو یا فارسی کی کوئی اور کتاب موجود نہیں جس میں خیالات کی وہ فراوانی ہو جو علامہ کے کلام میں ہے۔اور اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں۔علامہ کا کلام نصف صدی کے مطالعے، تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہے، اور سیر و سیاحت سے پیدا ہونے والے شعور کا نتیجہ ہے۔اُس اندرونی علم و ادراک کا ترجمان ہے جو ایک طویل عرصے کے مطالعہ، اپنی تاریخ سے مکمل واقفیت، اور حالاتِ حاضرہ کے سنجیدہ مشاہدے سے آپ کو حاصل ہو چکا تھا۔آپ کی بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع ایسا ہے کہ اُس پر مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔مثلاً ایک سادہ سا شعر سنیے اور بحرِ معانی میں غوطہ لگائیے: ؎ عقل گو آستاں سے دُور نہیں -- اِس کی تقدیر میں حضور نہیں۔ اِسی طرح ایک رباعی پر غور فرمائیے: ؎ خودی کی خلوتوں میں گُم رہا میں، خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں -- نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست، قیامت میں تماشہ بن گیا میں۔

علامہ کے ۱۲،۰۰۰ اشعار محفوظ ہیں۔(۷،۰۰۰ فارسی میں اور ۵،۰۰۰ اردو میں)۔ علامہ اپنے مجموعہ ہائے کلام (سوائے ارمغانِ حجاز) خود مرتب اور پرنٹ کروا گئے۔

اسرارِ خودی	فارسی	۱۹۱۵ء	(اسکی اشاعت پر سَر کا خطاب ملا)
رموزِ بے خودی	فارسی	۱۹۱۷ء	(اسلامی طرزِ زندگی)
بانگِ درا	اردو	۱۹۲۴ء	(ابتدائی اردو کلام)
پیامِ مشرق	فارسی	۱۹۲۴ء	(گوئٹے کا جواب، روحانیت کی اہمیت)
زبورِ عجم	فارسی	۱۹۲۷ء	(سخنے نگفتہ را چو قلندرانہ گفتا)
جاوید نامہ	فارسی	۱۹۳۲ء	(افلاک کی سیر)
بالِ جبریل	اردو	۱۹۳۵ء	(سپین کے دورہ کے بعد)
پس چہ باید کرد (مع مسافر)	فارسی	۱۹۳۶ء	(افغانستان کے دورہ کے بعد)
ضربِ کلیم	اردو	۱۹۳۶ء	(اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف)
ارمغانِ حجاز	فارسی	۱۹۳۸ء	(طرزِ حجاز کا تصور جدید تحریکوں پر تنقید)
لیکچرز	انگریزی	۱۹۳۰ء	Reconstruction Of Religious Thought In Islam

قومی افق پر آپ کی اہمیت کے پیشِ نظر تمام مشاہیر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تبادلہ خیالات کرتے ۔ مئی ۱۹۳۶ء میں قائدِ اعظم اور فروری ۱۹۳۸ء میں نہرو نے جاوید منزل میں آپ سے ملاقات کی ۔مولینا محمد علی جوہر اور مولینا شوکت علی اکثر تشریف لاتے اور قیام فرماتے ۔مولینا محمد علی جوہر تو سر راس مسعود کی طرح آپ کو صرف اقبال کہہ کر مخاطب کرتے ۔لیکن حکومت اور عوام میں برابر مقبولیت اور پذیرائی کے باوجود آپ کی روزمرہ زندگی سادگی کا مرقع تھی ۔آپ کے لباس یا معمولات سے کسی تفاخر کا اظہار نہ ہوتا ۔آخری دنوں میں قلب، دمے اور گلے کی بیماریاں لاحق ہو چکی تھیں ۔آواز خراب ہو گئی تھی ۔ڈاکٹروں نے علاج کے لیے آسٹریا جانے کا کہا تو یہ کہہ کر تجویز رد کر دی کہ میں اپنے علاج کی خاطر اپنے بچوں کی بہتر زندگی کا حق غصب نہیں کرنا چاہتا ۔موتیا بند کا مرض بھی ہو گیا تھا ۔اپریشن کرانا چاہتے تھے لیکن کروایا نہیں ۔علاج کے لیے کچھ عرصہ نواب بھوپال کے ہاں مقیم رہے ۔اس عالم میں جو نظمیں لکھیں وہ ضربِ کلیم میں شامل ہیں ۔زندگی کے آخری سالوں میں جموں کشمیر کی سیر کی خواہش ،اور زیارتِ حرمین شریفین کا ارادہ تھا اور اس سفر سے متعلق اشعار بھی لکھ لیے تھے جو آپکی رحلت کے بعد ارمغانِ حجاز کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ،لیکن افسوس اس مبارک سفر کا موقعہ بھی نہیں مل سکا ۔اس دور کی ایک رباعی ہے:

؎ بایں پیری رہِ یثرب گرفتم، نوا خواں از سرُورِ عاشقانہ ----- چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام، کشد پَر، بہ فکرِ آشیانہ۔

خلافت کو مسلمانوں کے لیے موزوں نظام سمجھتے تھے ۔ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم راوی ہیں کہ جنوبی پنجاب کے ایک بزرگ عالم کے پاس ایسے فارم بھی موجود تھے جو علامہ نے تحریکِ خلافت کی رکنیت کے لیے چھپوائے تھے۔ محمد حسنین سید نے آپ کی وفات کے فوری بعد شائع ہونے والے اپنے ایک تعزیتی مضمون میں یہ روایت بھی کی ہے کہ آخری عمر میں نثر میں موجودہ حالات کے مطابق ایک فقہ اسلامی مرتب کرنے کا بھی خیال تھا،اس کے لیے مشرق ومغرب سے مواد اکھٹا کر رہے تھے لیکن افسوس موت نے مہلت نہ دی۔ اپنی وفات سے قبل مولینا سید ابوالحسن ندوی کے ساتھ نئی مملکت میں نظامِ زکوٰۃ اور بیت المال کا بھی تذکرہ کیا ۔آخرِ عمر حبِ نبی میں بالکل ڈوب گئے تھے۔ رسول اللہ کا ذکر سنتے ہی آنکھیں بھر آتیں ۔چنانچہ انہیں دنوں یہ پرسوز اور موثر رباعی آپ کی زبان سے نکلی جو پڑھ کر انسان پر رقت طاری ہو جاتی ہے:

؎ تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر، روزِ محشر عذرہائے من پذیر ----- ور اگر بینی حسابم ناگزیر، از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر۔

ہر عظیم دماغ کی طرح علامہ کو آخرِ عمر میں ذہنی تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا ۔علالت کی کمزوری و ناتوانی کی وجہ سے جاوید منزل کے ایک گوشہ میں چارپائی پر کبھی لیٹے ،کبھی تکیوں کے بل بیٹھے حقہ پیا کرتے ۔اکثر افسردگی کے ساتھ کہا کرتے ،"سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں ،میرے پاس آ کر کوئی نہیں بیٹھتا"۔ اس احساسِ تنہائی کا سراغ پیامِ مشرق کی نظم تنہائی سے، یا ارمغانِ حجاز میں شامل کچھ اشعار سے بھی ملتا ہے ۔تنہائی میں خیالوں میں گم رہنے لگے تھے ۔بعض اوقات اپنا ہی کوئی شعر گنگناتے ہوئے ان کا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور فضا میں گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آ گرتا ۔ساتھ ہی سر کو ہلکی سے جنبش ہو جاتی ۔ایک دفعہ اونگھ رہے تھے ۔یکا یک جاگ کر ملازم سے بولے، "ابھی ابھی مولانا روم اُٹھ کر باہر گئے ہیں ،اگر چلے نہیں گئے تو انہیں بلا لاؤ میں نے کچھ پوچھنا ہے"۔

تقریباً 61 برس کی عمر میں اِس عاشقِ رسول ،حکیم الامت، دانائے راز، علامہ ،ڈاکٹر ،سَر محمد اقبال بار ایٹ لاء نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں وفات پائی ،اور بادشاہی مسجد کے صدر دروازے کے ساتھ مدفون ہوئے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

حضرات! علامہ کے مزاج میں یہ گہرائی، یہ فکر، یہ علم، یہ ادراک، یہ دانش آخر کیسے جمع ہو گئیں ۔ یہ علامہ کی عمر کے پہلے پندرہ سال ہی تھے جس دوران ان کی شخصیت میں عمیق مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا اور جس کی بدولت گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے فلسفہ، یورپ سے پی ایچ ڈی اور بار ایٹ لاء کے دوران مسلسل سوچ ،موازنہ اور تجزیہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن گیا ۔سیاسی حالات کی بدلتی کروٹوں کو دوسروں سے پہلے سمجھ جانے کے قابل ہوئے، اور الگ ملک کے قیام کی دور اندیشی پر مبنی اور قابلِ عمل تجویز دینے کے اہل ہوئے۔ میرا یہ خیال ہے کہ اس شاہکار کی تخلیق میں بچپن کے دور کی اُس تہذیبِ نفسی کا سب سے زیادہ دخل ہے جس نے سنجیدہ مطالعہ کا ذوق پیدا کیا ،جس نے اپنے ماضی کے ساتھ اُن کا تعلق جوڑا ،جس نے علومِ شرقی اور علومِ غربی ،دونوں کے لئے لگن پیدا کی ،اور سب سے بڑھ کر علمِ قرآن کا دخل ہے جو کہ تمام دانش کا منبع ہے ۔ورنہ دنیوی نظریات اور علوم تو ایک مستقل تغیر پذیری کی کیفیت میں رہتے ہیں ۔بقولِ شخصے: ؎ عِلم کیا، علم کی حقیقت کیا، جیسی جس کے خیال میں آئی۔

اوراب تبرکاً، علامہ کے تخیل کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے:

؎ خدائی اہتمامِ خشک وتر ہے، خداوندا خدائی دردِسر ہے ----- ولیکن بندگی، استغفراللہ، یہ دردِسر نہیں، دردِ جگر ہے۔

؎ یہی آدم ہے سلطاں بحروبر کا؟ کہوں کیا ماجرا اِس بے بصر کا! ----- نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں، یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟

اورتوجہ فرمایئے: ؎ عقل کو ملتی نہیں، اپنے بتوں سے نجات، عارف وعامی تمام، بندہء لات ومنات۔
خوار ہوا کس قدر آدمِ یزداں صفات! قلب ونظر پرگراں، ایسے جہان کا ثبات۔
کیوں نہیں ہوتی سحر، حضرتِ آدم کی رات؟؟ (حضرات، کوئی ہے دوسرا جس نے یہ مضامین باندھے ہوں؟)

اور بےقراری ملاحظہ فرمایئے:

؎ من کیئم تو کیستی، عالم کجاست؟ درمیانِ ما وتو، دوری چراست؟ ----- من چرا دربندِ تقدیرم؟ بگو، تو نمیری، من چرا میرم؟ بگو۔
؎ ہزاراں سال با فطرت نشستم، باو پیوستم و ازخود گسستم ------ ولیکن سرگزشتم ایں دو حرف است، تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔

اقبال مفکر ہونے کے باوجود ایک عملی آدمی تھے اور قوتِ عمل سے بھرپور قوم دیکھنے کے متمنی تھے۔ قسمت کے شاکی لوگوں کا گروہ انہیں ناپسند تھا۔

؎ عبث ہے شکوہء تقدیرِ یزداں - تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟؟

یا ؎ چہ کافرانہ قمارِ حیات مے بازی - کہ با زمانہ بسازی، بخود نمی سازی

؎ مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را، نسایدپیشِ غیراللہ جبیں را ----- اگر گردوں بکارِ اُو نہ گردد، بکارِ خود بگرداند زمیں را۔

حضرات گرامی! اجازت لینے سے پہلے آپکی توجہ اور غور کے لئے علامہ کی ایک رباعی پڑھنا چاہوں گا: غور فرمایئے:

؎ چو رختِ خویش بربستہ ازیں خاک، ہمہ گویند، باما آشنا بُود ----- ولیکن کس ندانست ایں مسافر، چہ گفت وبا کہ گفت واز کجا بُود۔

آپ کاشکریہ محترم حضرات، کہ آپ نے مجھ جیسے طالبعلم کو توجہ سے سنا۔ میں تو آپ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کر سکا، البتہ آپ کے تبصرہ سے میری تعلیم اور رہنمائی ہوجائے گی۔

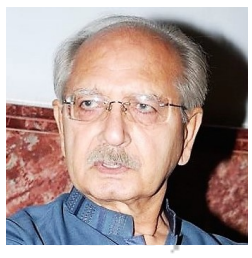

محمد بشیر ہرل۔
اتوار ۲۲ جنوری ۲۰۱۲ء
0333-6517766

**علامہ اقبال نے اپنی ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کی اِس تقریر میں اصل الفاظ جو استعمال کیے، وہ یہ تھے: (بحوالہ صفحہ ۳)

"I would like to see the Punjab, North-West Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single State. Self-government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-West Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims, at least of North-West India."

(مضمون نگار، واٹرز ٹریٹمنٹ پلانٹس بنانے والی معروف کمپنی، پی ایچ انڈسٹریز کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ انہیں مشرق ومغرب کے اکثر ممالک کے سفر کا اور وہاں کے لوگوں سے تبادلہء خیالات کا موقعہ مل چکا ہے۔
آپ پاکستان سٹڈی سرکل کے متحرک رکن، اور تاریخ وقرآنِ حکیم کے ایک طالبعلم ہیں)۔

*** حافظ شیرازی کے متعلق جو اشعار پہلے ایڈیشن میں شامل تھے لیکن دوسرے ایڈیشن میں شامل نہ کیے گئے، اُن میں سے چند -----

حافظِ جادُو بیاں شیرازی است　　عُرفیِ آتش زبان شیرازی است
اِیں قتیلِ ہمتِ مردانہ است　　آں، زِ رمزِ زندگی، بیگانہ است
بادہ زن با عُرفیِ ہنگامہ خیز　　**زندہ ای، از صحبتِ حافظ گریز!**

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار　　جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ، در بازارِ اُو　　از دو جام آشفتہ شُد دستارِ اُو
آں فقیہِ ملتِ مے خوارگاں　　آں اِمامِ ملتِ بے چارگاں
گوسفند است و نوا آموختہ است　　عشوہ و ناز و ادا آموختہ است
دلربائی ہائے اُو، زہر است و بس　　چشمِ اُو غارت گرِ شہر است و بس
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش　　چوں مُریدانِ حَسن دارد حشیش
محفلِ اُو در خورِ ابرار نیست　　ساغرِ اُو قابلِ احرار نیست۔
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر　　**الحذر، از گوسفنداں، الحذر!**

یہی گوسفند والے اشعار ہیں جن پر خواجہ حافظ کے عشاق نے آسمان سر پر اُٹھا لیا، اور علامہ نے دوسرے ایڈیشن سے یہ اشعار حذف کر دیئے۔ علامہ نے ایسے ہی جذبات کا اظہار افلاطون کے بارے میں بھی کیا تھا جو کہ تصوف کا بانی مبانی ہے، لیکن اُس کی تعلیمات سے عمومی بے خبری کے باعث اُس کے نام پر کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ لیکن چونکہ بے عمل خانقاہی نے دیوانِ حافظ کو فال نکالنے کی حد تک استعمال کرنا شروع کر رکھا تھا اور اُس کے بے عملی کی تعلیمات پر سر دُھننا ایک عام رواج بن چکا تھا، اس تبصرہ پر شور مچ گیا۔

بات کو سمجھنے کے لئے حافظ شیرازی کی غزل کے بارے میں مولینا حالی کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

"خواجہ حافظ کی غزل ہمیشہ سامعین کو عشقِ حقیقی کے ساتھ ساتھ عشقِ مجازی، صُورت پرستی اور کام جُوئی کی ترغیب دیتی ہے، اور دین و دنیا کی نعمتوں سے افضل بتاتی ہے۔ نظر بازی، اور شاہد پرستی کو علم و ہنر، مال و دولت، نماز روزہ، زُہد و تقویٰ۔ حج و زکواۃ سے بہتر ٹھہراتی ہے۔ وہ عقل و تدبیر، وقار و تمکنت، دور اندیشی اور ننگ و ناموس کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے۔ آزادگی، رسوائی و بدنامی کو، جو عشق سے حاصل ہو، تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولتِ دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کام نہ لینا، جوہرِ انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو اور پوچ گردانا، حقائقِ اشیاء میں غور و فکر سے گریز کرنا، کفایت شعاری کا دشمن رہنا، جو کچھ ہاتھ لگے، اس کو فی الفور کھو دینا، ایسے اسباق ہیں جو حافظ کی غزل سکھاتی ہے، اور یہ مضامین بے فکروں کو مرغوب ہوتے ہیں اور ان کو بے عملی کا جواز مہیا کرتے ہیں۔ خواجہ حافظ کی غزل کی حاسرت اور مزاولت سے ابرار و احرار کے دلوں میں بے شک دنیا کی بے ثباتی، توکل و استغناء اور قناعت کا پختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اوباش والواط کے بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی اور رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے۔"　　(حیاتِ سعدی از مولینا الطاف حسین حالی)

His choice of Cambridge was probably dictated by the fact that Cambridge was reputed for the study not only of European philosophy but also of Arabic and Persian. In his three years of stay abroad, Iqbal obtained a BA from Cambridge (1906), qualified as a barrister at London's Middle Temple (1906), and earned a PhD from Munich University (1908).